© rasailojaraid.com

معیّن کرنے کے لئے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ یہ تنقیدی جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ آج بقولِ اقبالؔ ملّتِ اسلامی کی ضرورت "کتابِ ملّتِ بیضا کی عالمگیر شیرازہ بندی" ہے۔ اس کے سوائے "یہ شاخِ ہاشمی" پھر نئے برگ و بار پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ جدید شیرازہ بندی اپنی ملّی بنیادوں کے صحیح و وسیع علم و یقین کے سوائے ناممکن ہے۔ اور یہ علمِ صحیح و یقینِ جازم حال و ماضی کے ایک حکیمانہ تجزیئے کے سوائے مشکل ہے۔ ٹھیک اسی ملّی و دینی ضرورت کے ماتحت راقم الحروف ان دونوں خیر اندیشانِ ملّت کے افکار و عقائدِ مخصوصہ کے متعلق چند باتیں کہنا چاہتا ہے۔

یہاں پر ایک دینی قاعدۂ کلّیہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک فرد کے اپنی ملت کے متعلق اخلاص و افادیت کو اس ملّت کے نصب العین اور اُس کے ایمان و عملِ صالح کے تابع رکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ محض افادیت یا محض خیر اندیشی کے سبب کسی فرد کو یا کسی ملّت کو دینی قرار دینا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر ہر ملّت کا وزہ میں ایسے ایسے جانباز و مخلص و مفید لوگ ملتے ہیں کہ اگر صرف اپنی اپنی ملت کے لئے مفید و خیر اندیش ہونا ہی سب کچھ ہے تو پھر نہ صرف ان سب کو مساوی قرار دینا ہوگا۔ بلکہ بعض اوقات ان کے مقابل بہت سے اہلِ ایمان و عملِ صالح آپ کو ہیچ نظر آئیں گے۔ چونکہ آج عالمگیر طور پر "کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی" کا معاملہ در پیش ہے۔ لہذا اُس کے پیشِ نظر ہمیں ماضی کی ہیرو پرستی کے ساتھ ہی حال کی ہیرو پرستی کو بھی ایک طرف کرنا ہوگا اور "کتابِ ملّتِ بیضا" کے تمام بنیادی حقائق کو حق الیقینی انداز سے معین کرنا ہوگا۔

رومیؔ و اقبالؔ کی اوپر عرض کردہ مشابہت کے بعد سرسری طور پر اُن کے فرق کو بھی بتانا مفید ہوگا۔

اقبال و رومی کا فرق رومیؔ، عشق کی آگ کے ذریعہ شعور و عقلِ انسانی کو پاک کرتا ہوا اور نفس کو ہوا و تمنّا سے فارغ کرتا ہوا حیاتِ انسانی کے رُخ کو "یزداں گیری" کی طرف موڑنا چاہتا ہے۔ بے عملی کے بجائے عمل، تعطّل کے بجائے جدّ و جہد، جبریت کے بجائے اختیار، گریز پائی کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کا مبلّغ ہونے پر بھی رومیؔ کا اصلِ مدعا متخالِف و متضاد راہوں کی طرف بھٹک کر نکل جانے والی "عقلِ جزوی" کو عشق و تزکیۂ نفس کی قوّت سے "عقلِ کلّی" سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے تزکیۂ نفس کے علاوہ عشق کو ایک مستقل عامل کی حیثیت سے وہ سیرتِ انسانی میں داخل کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رومیؔ ملّتِ اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے خارجی اتحاد کی راہیں بند دیکھ کر ایک فکری و ایمانی اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہے تاکہ عملی سطح کے ساتھ ہی کہیں فکری سطح پر بھی اُمّت میں انارکی پیدا نہ ہو جائے۔[1] چونکہ اس نامبارک و نامساعد ماحول میں بھی وہ اپنی ملّت کے متعلق پُر اُمید ہے لہذا اس کا اعتقاد ہے کہ اگر صرف فکری سطح پر ہی اُمّت کا اتحاد قائم رہا تو کچھ عرصہ گذرنے اور خارجی ماحول کے سازگار ہو جانے کے بعد یہ فکری اتحاد عملی کی سطح پر بھی نمودار ہو جائے گا۔ رومیؔ اس خالص داخلی وحدت کو (جس کا واحد ذریعہ اس کے ہاں عشق ہی) اکثر اوقات اس طرح کل دین قرار دے جاتا ہے کہ انسان کو دینِ مسیح کے پولوس رسول کی تعبیرِ دین بار بار یاد آتی ہے۔ اس دنیا سے حضرت مسیحؑ کے تشریف لے جانے کے بعد مسیحیت کی حالت یہ تھی کہ یہودی برادری تو اس دین کو مٹا دینے پر تُل گئی تھی۔ ادھر رومن حکومت میں یہ شکوک پیدا ہو گئے تھے کہ مبادا یہ نیا گروہ کسی وقت حکومت کے لئے خطرہ بن جائے۔ اگر رومن حکومت کو یہ خطرہ نہ بھی لاحق ہوتا تو بھی یہودی برادری اُسے حکومت کے لئے ایک نئے خطرہ کی حیثیت سے متعارف کرانے پر تیار تھی۔ ان حالات میں "پولوس" کے لئے صرف یہی راستہ کھلا تھا کہ وہ دین کے روحانی و اخلاقی حصّے پر زور دیتا اور اُس کے شرعی و معاشرتی پہلو کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیتا۔ اور ساتھ ہی یہودیوں کے علاوہ باقی انسانی کائنات کو بھی اپنی اخلاقی و روحانی تعلیم سے ہم آہنگ کرتا۔ "پولوس" کے اکثر نقاد اس بات کو عام طور پر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اصل چیز "پولوس" اور اس کے کشف و الہام و مساعی نہیں۔ بلکہ اصل چیز حضرت مسیحؑ اور اور ان کی تعلیم ہے۔ ادھر حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں یہ بات نہایت واضح کر دی گئی تھی کہ "مسیح شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آئے بلکہ اُسے قائم کرنے کے لئے آئے ہیں" اب اس صغریٰ و کبریٰ کا سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ ملّتِ مسیحی کو جب بھی موقعہ ملے گا وہ مسیحؑ کی اخلاقی و روحانی تعلیم کے ساتھ ہی شریعت کو بھی زندہ و ہمہ گیر کر دیگی۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ مسیحیوں کے لئے دینِ کامل کے رائج کرنے کا کبھی بھی موقعہ نہیں آیا۔ بلکہ قدرت نے یہ حصّہ اس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے مقدر کر رکھا تھا جس کے متعلق ایک آتشیں شریعت لیکر آنے کی پیشگوئی خود حضرت مسیحؑ کر گئے تھے۔ رومیؔ اور "پولوس رسول" محبّت کو کل دین قرار دینے میں نہایت درجہ مشابہت رکھتے ہیں۔ پولوس تو محبت کو اس درجہ

---

[1] یہ سوال علیحدہ ہے کہ محض عشق کے جذبے سے کل ایمان کی حفاظت ممکن بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینِ کامل بتانے پر آمادہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اتباعِ شریعت کو لعنتوں کا کام جانتا ہے۔ حالانکہ "پولوس" کے ماحول کو اور حضرت مسیحؑ کی کل تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے پولوس کا مفہوم صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص یہودیوں کی طرح دین کی ساری اخلاقی و روحانی تعلیم کو نظر انداز کرتا ہوا صرف اس کی شرعی رسوم کو کل دین قرار دیتا ہے، وہ لعنتی ہے۔ پولوس کا لعنتی قرار دینے کا فتویٰ اطلاقی حیثیت نہیں رکھتا، جیسا کہ بعد کے لوگوں نے اُسے قرار دے لیا۔ بلکہ وہ ایک کامل دین کے اندر جزوی سے مصالح کے لئے کام کرنے والے ایک مبلغ کا فتویٰ ہے۔ اطلاقی حیثیت تو حضرتِ مسیحؑ کی تعلیم کو حاصل تھی۔ پولوس تو عمر بھر اپنے آپ کو حضرتِ مسیحؑ کا ایک پیرو، ایک طفیلی اور اپنی تبلیغ کو ان کی تعلیم کی فرع بتاتا رہا۔ پولوس کے ہاں اپنے آپ کو فرع اور تعلیم مسیحؑ کو اصل قرار دینے کی بڑی تکرار ہے۔ وہ آئندہ کے کام کرنے والوں کے لئے موقف کو واضح رکھنا چاہتا ہے۔ ٹھیک اسی موقف کے اندر رکھتے ہوئے ہمیں رومیؒ کے مذہبِ عشق کو بھی سمجھنا ہوگا اور اسی فریم ورک میں رومیؒ کے اس عالم آشوب رجز کا مفہوم بھی متعین کرنا ہوگا ؎

مذہبِ عشق از ہمہ مذہب جداست　　　عاشقاں را مذہب و ملت خداست

رومیؒ انسانیت کے سارے شرق و غرب پر پھیلے ہوئے ایک سدا بہار درخت کی ایک چھوٹی سی شاخ ہے۔ قرآن مجید میں محبتِ الٰہی کا تو شاید دو ہی تین جگہ ذکر ہے مگر خشیت و خوف و تقویٰ سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے اور عشق کا تو سارے قرآن اور پورے ذخیرۂ روایاتِ صحیحہ میں شاید ہی کہیں نام بھی ہو۔ لہٰذا صرف محبت کی ایک شاخ، عشق (عشق، محبت کے اس درجے کا نام ہے کہ جسمیں ساری قوتِ تمیز کلی طور پر تحلیل ہو کر محبّ کے پاس ایک محبوب کے تصور کے علاوہ سب سوخت ہو جائے۔ ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　　ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

کو تمام اعمالِ صالحہ کا محرکِ تام قرار دینا یکسر ناروا ہے۔ لیکن اگر رومیؒ کے مخصوص تاریخی موقف کو سامنے رکھ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ رومیؒ کا سپرد کردہ مشن غالباً صرف اس قدر ہے کہ وہ نشۂ محبت کو وقتی طور پر اس درجہ تیز کر دے کہ امّت جس طرح ایک جبّار کافر طاقت کے سامنے ظاہراً مغلوب ہو گئی تھی، اسی طرح اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باطنی شیرازۂ افکار سے بھی دست بردار نہ ہو جائے۔ فرض کرو کہ کسی خاص بیماری کے عام ہونے کے باعث کوئی ایک وٹامن انسانوں میں ختم ہونے لگے اور اُس کی عام مہیائی کے لئے کسی حکیم کو کام کرنا پڑے۔ اب اِس حکیم کا اس خاص موقف میں فرض صرف اس قدر ہو کہ لوگوں کو اِس مفقود ہونے والے وٹامن کو مہیا کرنے کی ترکیب بتلا تا جائے۔ اِسی پر اس کے لیکچرز ہوں اور اسی کے متعلق اس کی ہدایات ہوں۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو گویا دیانتداری سے اپنا فرض پورا کر دیا۔ لیکن اگر موسم کے بدل جانے کے بعد کوئی ایسا عطائی اور متطبب گروہ سارے فنِ طب کو ایسی ایک وٹامن کی اہمیت کے ارد گرد لپیٹ دے تو وہ یقیناً باطل ہوگا اور معاشرے کے لئے مضر ہوگا۔ محض عشق کو تمام فرائض و واجباتِ انسانی کا محرکِ کامل بتانا یکسر باطل ہے۔ لیکن جس وقت ایک عالمگیر بیماری۔ مثلاً یاس۔ کا علاج اسی سے ممکن ہو اُس وقت اسی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہی خدمتِ دین و ملت بھی ہے۔ مگر اسی وقتی افادیت کے زیرِ اثر اُسے دین و اخلاق کی کُل کائنات قرار دینا ایک ملت کے لئے بہت ہی بڑی مضرت بھی ہے۔ اتنی بڑی مضرت جو اُسے شاید کسی بحرانی دور میں ارتدادِ کُلّی کی طرف لے جائے۔

عشق کو ایک ہنگامی دردِ ملت قرار دینے والی مثنوی کو جب "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" قرار دیکر آئندہ اس کی شرح نویسی شروع ہوئی تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کی مضرت اس کی افادیت سے ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ حضرت "عشق" کی تاریخ کو سامنے رکھ کر کون باخبر انسان ہے جو یہ تسلیم نہ کریگا کہ اس عنوان "عشق"۔ سے اگر ایک انسان کو فائدہ پہونچا ہے تو اس کے مقابل ایک ہزار نے اسی کے ماتحت صرف ہوس رانی کے جواز کی صورتیں پیدا کی ہیں۔ اگر ایک رومیؔ کے زمانے میں اُس نے رابطۂ ملت کی حفاظت کا کام دیا ہے تو زمانہائے دراز سے حیا، عفت و اخلاق کی اناری اور شعائرِ ملت کی کھلی توہین کے لئے بھی اُسے استعمال کیا گیا ہے۔

پولوس رسول و رومی کا فرق | عشق و محبت کو اخلاقی و روحانی حیات کا محرکِ کامل بتانے کے علاوہ پولوس رسول اور رومیؔ میں عمل کی سطح پر بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے۔ پولوسؔ کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص کس طرح عمر بھر عشق و محبت کا شعلۂ جوالہ بن کر ملکوں ملکوں گھومتا رہا۔ یہانتک کہ عیسائیت کے بہت سے مورخین تو فتویٰ دیتے ہیں کہ اگر پولوسؔ نہ ہوتا تو عیسائیت شاید ہی عالمی مذہب بن سکتا۔ مگر عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی سطح پر ہیں عاشق رومی میں پولوس کی جدوجہد کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے ذریعہ سے عشق ومحبت کی گرمی پیدا کرنے کے علاوہ رومی کی زندگی صرف چنگ ورباب پر حال کھیلنے تک محدود رہی اور اسی میں اس کا سفرِ حیات ختم ہو جاتا ہے۔ کیا شعر کا دائرہ عمل ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔

شاعر کا دائرہ حیات | روایاتِ اسلامی میں ذکر آتا ہے کہ جنگِ احزاب کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت کو گھروں کی حفاظت کا کام سپرد کر دیا تھا۔ لیکن جب ایک موقعہ پر ایک یہودی مسلمانوں کے گھروں کے ارد گرد گھومتا ہوا دکھائی دیا اور ایک صحابیہ نے حضرت حسان سے اس کا تدارک کرنے کو کہا تو حضرت حسان نے شاعر ہونے کا اقرار کرتے ہوئے اس تدارکِ خطرات سے معذوری ظاہر کی۔ اس کے بعد وہی صحابیہ اس یہودی کی طرف متوجہ ہوئیں اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اب انھیں حسان بن ثابت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی یاد رکھنی چاہیئے "اے اللہ حسان کو روح القدس کی تائید بخش"۔ یہ ہے سعید سے سعید شاعر کا دائرہ حرکت وعمل۔ اور اسی مقام پر قرآن مجید کی آیاتِ ذیل بغور ملاحظہ کر لینے کی ضرورت ہے۔

"الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ - اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ - وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ - اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ -

خلاصہ مطلب۔ شاعری کا اتباع گمراہی۔ اس لئے کہ اتباع ہوتا ہے عمل میں اور شاعر کے ہاں معیاری عمل تو کیا سرے سے عمل کا خانہ " وھم یقولون ما لا یفعلون" ہوتا ہے

بڑے سے بڑے اور سعید سے سعید شاعر کی یہ حدود ہیں۔ شاعر جو بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے وہ ہے انتصارِ حق کے لئے جذبات کو تیز کرنا۔ یہ کام حضرتِ حسان خوب کرتے تھے لیکن شاعری کے ذریعے حقائقِ دین کی تعیین وتعریف وتشریح ناممکنات سے ہے اس لئے کہ شاعری کی کل کائنات جذبے اور تخیل کی آمیزش سے بنتی ہے۔ ادھر جذبے کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک ہنگامی بخار ہے، جسے تخیل کوئی موزوں لباس پہنا کر مارکٹ میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اِدھر ایمان قلبِ مومن میں یقین کی اس یکسانی کا نام ہے، جو اعمال کے لئے ایک مسلسل اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی نہ ختم ہونے والا محرک ثابت ہو سکے۔ ایمان کا سرچشمہ یقین ہے نہ کہ جذبہ۔ یہی سبب ہے کہ نبی کے متعلق قرآن مجید "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ" ہمنے اُسے شاعری نہیں سکھائی" فرماتا ہے۔

لہذا کسی شاعر کو "پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" یا "ہست قرآں در زبان پہلوی" کہنا یکسر باطل ہے۔ حقائق دین کو گرفت میں لانے کے لئے "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" کی ٹکٹکی باندھ کر اور جذبے کے اتار چڑھاؤ اور مسلسل ناہمواریوں سے یکسر آزاد بصیرت کی ضرورت ہے اور شاعر کے ہاں اس کے بجائے گرگٹ کی طرح نت نئے رنگ بدلنے والی جذباتیت کے علاوہ اگر اور کچھ ہے تو وہ صرف تخیل ہے، جو حقائق کو گرفت میں لانے کے بجائے اُن پر رنگ و روغن چڑھانے کا کام کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعری کا اتباع ابتدا میں تو توہمات و جذبات پرست اور بعد میں کچھ کو لاادری اور کچھ کو انارکسٹ بنا ڈالتا ہے۔ شعر کی ماہیت کے متعلق یہ حروف اس لئے ضروری ہیں کہ اقبال و رومی دونوں شاعر تھے اور شاعری کی حیثیت سے ان کا تذکرہ یہاں پیش نظر ہے۔

رومی و اقبال کے عشق کا فرق رومی کے ہاں عشق کی صرف وہ شکل قابلِ حصول و قابلِ تعریف ہے، جو نفس انسانی میں سے ہوا و ہوس کی تمام آلائشوں کو جلد ختم کرتے ہوئے انسان کی تمام صلاحیتوں کا رُخ خدا یعنی محبوب حقیقی کی طرف کر دے۔ اس کے علاوہ عشق کی تمام صورتوں کو وہ "خمارِ آردِ گندم" اور ہوس رانی قرار دیتا ہے۔ رومی کے ہاں عشق کا پورا وظیفہ ہی سرے سے یہ ہے کہ نفس کو ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے پاک کر دے تاکہ "لقائے رب" کے درمیان اور عاشق بے تاب کے درمیان کوئی حاجب نہ رہ جائے، اور قلب کے لئے "عکسِ مہرویان بستانِ خداست" کا آئینہ بننے کا پورا پورا موقعہ پیدا ہو جائے۔ اور بالآخر پوری زندگی رضائے محبوب میں فنا ہونے کے مقام پر آ جائے۔ رومی کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ زندگی میں صرف صعودی حرکت کو مطلوب و مقصود قرار دیتا ہے۔ اُس نے ارتقائی نظریے کی طرف بعض بعض مقامات پر جو اشارات کئے ہیں وہ بلا خوفِ تردید و تضاد زندگی کی خدا کی طرف پرواز ہے۔ اس کا بڑا ذریعہ اور شاید واحد ذریعہ عشق ہے۔ رومی کی زندگی میں سے عشق نے سب تضادوں کو ختم کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ جذب الی اللہ کے سوائے اور کسی راہ پر بھٹک نکلنے کا اس کے ہاں کوئی امکان نہیں رہا۔ اسی مقام پر رومی اقبال کا شیخ و مرشد اور نصب العین بن گیا ہے۔ جسے سامنے رکھ کر اقبال نے مدت العمر اپنی زندگی میں سے تضاد کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر آخری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دم تک یہ حالت رہی (الف) کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رومی

(ب) خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(ج) خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے دل خرد سے

(د) تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر: خرد میری ہوا زنگی مرا ایماں ہے زناری (اقبال)

صدر کے اشعار سے اور اقبال کی پوری زندگی سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کو وہ سکون و جذب الی اللہ عمر بھر حاصل نہ ہو سکا جو اسے اور سب کو رومی میں محسوس ہوتا ہے اور جس کے باعث رومی ساری عمر اقبال کا نصب العینی نشانہ رہا ہ

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور — تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے

ہ آتشے بگرفت و زند در خس و خاشاک من — مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

ہ اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو — اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

ع دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا — ع زندہ را نفی تمنا مردہ کرد

ع نا توانی سینہ را از آرزو آباد دار — ع تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں (اقبال)

ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لئے کہ اقبال و رومی کے ہاں عشق کے لفظ میں صرف لفظی حد تک اشتراک ہے ورنہ معنی میں کوئی اشتراک نہیں رومی کے ہاں تو عشق محبت کی اس انتہا سوز آخری ڈگری کا نام ہے جو محبوب حقیقی کے علاوہ باقی چیزوں کو عاشق کے نفس میں سے جلا کر خاکستر کر دے

ہ عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت — ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت (رومی)

نفس انسانی میں سے ہوا و تمنائے خام کی تمام آلودگیوں کو جلا کر خاکستر کرتے ہوئے قلب و روح انسانی کے لئے وہ فراغ کلی مہیا کرتا کہ وہ (یعنی قلب و روح) "عکس مہرویان بستان خدا" کے مسلسل آئینہ دار بن جائیں رومی کے ہاں عشق کا واحد وظیفہ حیات ہے۔ لیکن اقبال کے ہاں عشق کا وظیفہ رومی کی طرح نفی ہوا و ہوس کے بالکل برعکس خود ہوا و ہوس کی مسلسل تخلیق ہے۔ اقبال کی شاعری کا کلمہ طیبہ "خودی" ہے۔ اس خودی کی تربیت و نما، تغذیہ و تمرکز آرزو و تمنا (وہی ہوا و ہوس) سے ہوتی ہے اور تخلیق تمنا و آرزو کا واحد ایجنٹ اقبال کے ہاں عشق ہے۔ ہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

۵ نگہ دارند ایں جا آرزو را سرور و ذوق و شوق و جستجو را

خودی را لازوالے می تواں کرد فراقے را وصالے می تواں کرد

ع ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم (اقبال)

اب یہ ایک اٹل اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قلب و روح کی "منزلِ کبریا" کی طرف پرواز کرنے کا اگر کوئی دشمنِ جانی اور حاجبِ اکبر ہے تو وہ ہوا و تمنا ہے۔ جس قدر آرزو و تمنا کی کثرت ہوگی اسی قدر طمانیتِ روح و قلب کا فقدان ہوگا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ "مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى" (القران) "لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

چونکہ رومیؔ کے ہاں عشق کا وظیفہ نفیٔ ہوا و تمنا کرتے ہوئے پوری ہستیٔ انسانی کو "صبغۃ اللہ" کے رنگ کا بپتسمہ دینا ہے۔ لہٰذا اس کے ہاں تمام اخلاقِ انسانی ایک قدرتی انداز میں اخلاقِ خداوندی کے رنگ میں رنگ دیئے جاتے ہیں اور انسان "آنچہ اندر وہم ناید آں شوم" کی وادی کی طرف محوِ پرواز ہو جاتا ہے۔ مگر اقبالؔ نفس کو اسی غیر مزکیٰ حالت میں لیتا ہے کہ جس حالت میں نفس عام طور پر ہوتا ہے اور کسی مجاہدہ نفسانی یا کسی اخلاقی ضابطے کے ذریعہ ڈسپلن دینے کے بجائے تخلیقِ آرزو و تمنا کی اسے لیبارٹری بنا ڈالتا ہے۔ اگر اس میں سستی آجائے تو عشق کے ایجنٹ، کا چابک اس کی انگیخت کے لئے موجود ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں طمانیتِ قلب، یکسانیٔ ظاہر و باطن کی دولت کیوں میسر آنے لگی۔ اس حالت میں تو ظاہر، باطن کا دائمی حریف رہے گا اور باطن، ظاہر کا ابدی رقیب۔ یہ ہے اقبالؔ کے فکر و جذب کے دائمی تضاد کا اصلی سبب۔ ۵

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے خرد بیزار دل سے دل خرد سے۔ (اقبال)

اخلاقیاتِ رومی و اقبال | رومی کے ہاں، اخلاقِ انسانی کی تکمیل یہی ہے کہ عشق کی قوت سے یا عشق کی آگ سے نفس کی تمام خواہشات کو جلا کر ان کی خاکستر کو ایک طرف پھینک دیا جائے اور تمام انسانی صلاحیتوں کو محبوبِ حقیقی کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اس طرح نفسِ امارہ، نفسِ مطمئنہ ہو جائے گا اور حیوانی جبلت، اخلاقِ حسنہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بدل جائے گی۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھ لینے کی ہے کہ رومی کے ہاں ساری اخلاقی کائنات کے ساتھ ہی ساری روحانی کائنات کا محرکِ کامل صرف جذبۂ عشق ہے۔ رومی کے ہاں عشق خود مذہبِ کامل ہے۔ ۵

عاشقاں را مذہب و ملت خداست　　　مذہبِ عشق از ہمہ مذہب جداست

لیکن اقبال کے ہاں چونکہ کل دین "خودی" کی تشریح ہے اور خودی کی پختگی ہوا و تمنا کی کثرتِ پیداوار پر منحصر ہے اور ہوا و تمنا کا واحد ایجنٹ (sole agent) چونکہ عشق ہے۔ لہذا اقبال کے ہاں اخلاق کی دنیا بھی بالکل جُداگانہ نوعیت کی ہے۔ اقبال کا عملِ صالح یا اخلاق کا تصور شیر اور چیتے اور جرہ و باز کے اخلاق (بشرطیکہ اُسے اخلاق کہنا جائز ہو) سے ملتا جلتا ہے جس کی نوعیت "جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا" قسم کی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ الیقین ہے کہ اگر اقبال یورپ میں پیدا ہوتا تو وہ نٹشہ ہوتا اور اگر نٹشا مشرق میں پیدا ہوتا تو وہ اقبال ہوتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب میں اخلاق نصفِ دین ہے اور اگر شیر و چیتے اور جرہ و باز کی مطلق قسم کی جارحیت کو اخلاق کا نام دینا جائز ہے تو پھر یہ کہنا عینِ حق ہے کہ اقبال کے ہاں دینی اخلاق یا اخلاقی اخلاق کا نام تک نہیں۔ حرکتِ مسلسل جس کا محرک کثرتِ ہوا و تمنا ہو اور جس کی نوعیت شیر و چیتے اور شاہباز و جرے کی سی جارحیت رکھتی ہو، اقبال کے ہاں اعمالِ صالحہ کی کل کائنات ہے۔ ٹھیک یہی سبب ہے کہ اقبال کے ہاں غزالی و کانٹ کا گذر نہیں مگر برگساں و نٹشہ کی پوری پوری آؤ بھگت ہے۔ تاریخِ اخلاق کو نٹشہ کے انداز پر مطلق جارحیت سے بدل دینا اقبال کے ہاں شاید بہت بڑی خدمتِ انسانی ہے۔ اپنی ارتقائی تعلیم میں اقبال برگساں کے "تخلیقی ارتقار" کا قائل معلوم ہوتا ہے مگر "پلٹنا جھپٹنا (اور) جھپٹ کر پلٹنا" سے تو ڈاروِن کے عقائد کی غمازی ہوتی ہے۔

رومی عشق کے نغموں سے فضا کو معمور کرتا ہوا ایک طرف اُمت میں "رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ" کی فضا پیدا کر دیتا ہے تو دوسری طرف چنگیزی ملت کے دینِ جارحیت کے مقابل تخلّق باخلاق اللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ رومی کے ہاں "تَخَلَّقُوا بِاَخلاقِ اللهِ" کی فہرست سے جہاد بھی خارج نہیں۔ اگرچہ جہاد کا محرک بھی حضرتِ عشق بتانا نادرست ہے۔ ۵

---

۵ اپنے لیکچرز میں اقبال نے غزالی و کانٹ کی کڑی تنقید کرتے ہوئے انہیں غیر موصل الی المطلوب ظاہر کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امرِ حق را ہم با مرِ حق شکن   بر زُجاجِ دوست سنگِ دوست زن

رومی نے اس شعر سے جہاد کی توجیہہ کی ہے جو درست نہیں۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ جہاد معاشرتی اخلاق کا ہی ایک حصّہ ہے اور اُسے محض روٹی بیٹی کی حیوانی جہد للبقا سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاد صرف اس جنگ کا نام ہے جو انصاف کو قائم کرنے اور کلمۂ حق کی بقا و غلبہ کے لئے ہو۔ شہرت، عزت، زن، زر، زمین کے لئے جو جنگیں ہوتی ہیں وہ ٹھیک حیوانی جنگ للبقا کا حصّہ ہیں اور کتابِ جہاد سے یکسر خارج ہیں۔

رہا "سوز و ساز و ترکتاز و آرزو و جستجو" تو اقبال کو خود تسلیم ہے کہ اس کے لئے جوجہد و سعی ہوتی ہے، جبریل کی "اللہ، اللہ، اللہ" کو اس میں اتنا دخل بھی نہیں جتنا ابلیس کی ہوا سازی و تمنا تراشی کو ہے۔ ـه[1] ہوا و تمنا کی انگیخت سب ابلیس کی کارکردگی ہے " فَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "، وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ" "يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا "

اقبال کا تصورِ خدا | اقبال کے تصورِ خدا کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ انسان کے تخلیقی انا (جسے اقبال خودی کہتا ہے) یا کائنات کی تدریجاً ارتقا پذیر کلیت کے تابع ہے۔ وہ ان دونوں کا تقدیر کنندہ ہونے کے بجائے کچھ اس قسم کی پوزیشن رکھتا ہے کہ خود یہ دونوں یعنی انسان کی تخلیقی انا اور کائنات کی ارتقا پذیر کلیت خدا کی حدود و وظائف معین کرتے ہیں۔ ـه

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ـه مرا از خود بروں رفتن محال است   بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم
زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست   تجلّیٔ دگرے درخورِ تقاضا نیست

اب اگر اقبال کی شاعری کے ساتھ اس کے لیکچرز ـه[2] کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو پھر خدا کو وقت کے اطلاقی مفہوم کے ہم معنی سمجھنا چاہیئے۔ ماضی و مستقبل و حال کی اضافت سے آزاد کرتے ہوئے وقت کا جو اطلاقی مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں خدا کا مفہوم کچھ اسی سے ملتا جلتا ہے۔ اب یہ تصور یہ گساں سے

ـه[1] مکالمۂ جبریل و ابلیس ـه[2] اقبال نے اپنے لیکچرز کے آغاز میں ہی اس کا اقرار کیا ہے کہ ان لیکچرز کے دوران اس کا موقف ہرگز دینی نہیں بلکہ آزاد فلسفیانہ موقف ہوگا اور اس کا نقطۂ نگاہ تخلیقی کے بجائے وجودی ہوگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس قدر ماخوذ ہی، خارج از بحث بات ہوگی۔ البتہ اتنا ضرور کہدینا چاہیئے کہ اقبال اس ہم جنسِ زمان خدا کو ایسے کسی کلی شعور سے متصف نہیں مانتا جو شعورِ ماکان و مایکون کے تمام کلی وجزوی امکانات پر حاوی ہو۔ اس لئے کہ اس طرح بطنِ اقبال تخلیقی انا اور تدریجی ارتقا میں جبریت ماننا پڑتی ہے۔ لہذا انسان وکائنات کی خود ارادیت کو بحال رکھنے یا بحال کرنے کے لئے اللہ کے علم واختیار کے دائرے کو محدود کرنا پڑتا ہے۔

اب خدا کے مذہبی تصور کے متعلق یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ "یفعلُ ما یشاءُ"۔ "فعّالٌ لِما یُرِیدُ" "اللہُ خالقُ کلِ شیئٍ وھو علی کلِ شیئٍ وکیل" "علی کل شئٍ قدیر" اور اس کا علم تمام ان چیزوں کے ساتھ جو کہ منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ تمام ان چیزوں پر بھی کلی احاطہ رکھتا ہے جو ابھی عالمِ غیب میں پڑی ہیں۔ اس لئے کہ وہ "عالمُ الغیبِ والشھادۃِ" ہے۔

کائنات کے متعلق تین متضاد تصور

اس مقام پر مفید ہی نہیں بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے متعلق انسانی تاریخ کے تین مکاتبِ فکر کا ذکر کردیا جائے۔ تاکہ مذہبی نقطۂ نگاہ بالکل واضح ہوجائے۔ اور رومی واقبال کا مذہبی مقام بھی معلوم ہوجائے۔ کائنات کے متعلق نوعِ انسانی میں تین تصور متوازی رنگ میں جاری رہے ہیں۔ جو اگرچہ اپنی اصل میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پھر بھی عملی تشکلوں میں بالعموم تینوں کو اس طرح خلط ملط کردیا جاتا ہے کہ تینوں میں سے ایک بھی اپنی منطقیانہ شکل میں شاذ و نادر ہی کہیں ملتا ہے۔ ایک تو کائنات کے متعلق بالکل باطنی نقطۂ نگاہ ہے، جسے نفسی یا نفسانی نقطۂ نگاہ کہنا زیادہ صحیح ہوسکتا ہے۔ مگر عام طور پر اُسے روحانی نقطۂ نگاہ کہہ کر خلطِ مبحث کی بنیاد ڈالدی جاتی ہے۔ اُسے فلسفیانہ زبان میں وجودی نقطۂ نگاہ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا نقطۂ نگاہ وہ ہے، جسے خارجی نقطۂ نگاہ یا آفاقی نقطۂ نگاہ کہا جاتا ہے۔ اُسے خالص مادی نقطۂ نگاہ بھی کہتے ہیں۔ تیسرا نقطۂ نگاہ تخلیقی نقطۂ نگاہ ہے۔ اُسے مذہبی نقطۂ نگاہ کہنا چاہیئے۔

پہلا اور دوسرا نقطۂ نگاہ حتمی طور پر لادینی نقطۂ نگاہ ہے۔ اگرچہ باطنیہ گروہ لادین کہلانے سے اکثر منکر رہا ہے۔ بلکہ انھوں نے دین کے نام پر سیکڑوں اور ہزاروں فرقوں کی تخلیق کی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات کل حقیقتِ دین کے واحد اجارہ دار بن بیٹھے ہیں۔ جو قطعاً خود فریبی کے ساتھ ہی فریب کاری وفریب دہی بھی ہے۔ خلافِ واقعہ ہے۔ اب اقبال ورومی کے متعلق ساری احتیاطوں کے باوجود یہ کہنا عینِ حق ہے کہ اپنے اساسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکر میں سارے انکاروں کے باوجود اقبالؔ سو فیصدی کے قریب وجودی ہے اور رومیؔ پچاس فیصدی کے قریب وجودی ہے۔ اپنے لیکچرز کے آغاز میں ہی اقبالؔ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان لیکچرز کے دوران میں اُس نے وجودی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ یہ ہے خدا کو وقت کے اطلاقی مفہوم کے ہم معنیٰ اور توأم بنانے کی فکرِ اقبال کی بنیاد۔

وجودی نقطۂ نگاہ کا مذہب پر ظلم صریح وجودیت کے سارے مکاتب، کائنات کے تمام مدارج میں ایک ایسی جزوِ مشترک کے قائل ہیں جو سب چیزوں میں وجہِ مشترک ہے۔ ایسا تسلیم کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جب سب اشیاء، سب سلسلۂ ہستی اور سب کائنات کی اس جزوِ مشترک کو خدا قرار دیا جاتا ہے تو انسانیت پر اور اُس کے دین و آئین پر یہ بات ایک ظلمِ صریح اور قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جو چیز افلاطونِ الٰہی' میں اور ایک گدھے میں، ایک ذرۂ بے مقدار میں اور آفتاب میں، سُوّر جیسی ایک نجس بالذات چیز میں اور ایک تیتر جیسے طیب و طاہر پرندے میں، مشک و عنبر جیسی ایک نفیس چیز میں اور گوبر پاخانے جیسی ایک ناپاک چیز میں اساسِ مشترک ہوگی وہ ہستی کا یا سلسلۂ کائنات کا ایک ارزل ترین، خسیس ترین اور اسفل ترین اعتبار تو ہو سکتا ہے مگر وہ اس سلسلہ کا اعلیٰ ترین اعتبار ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔ چاہے دنیا جہان کے سارے منطقی اور تمام فلسفی ملکر بھی اُس پہ "جنسِ عالی" کا جھوٹا لباس پہنا دیں۔ ہستی کی اعلیٰ اعتبارات کا ظہور تو اعلیٰ ترین (جو وجود میں موخر ترین ہوتے ہیں) انواع میں ہوتا ہے۔ مثلاً انسانوں میں اور ملائکہ میں۔ اس لئے جو چیز سب ارزل و اعلیٰ انواع کا جزوِ مشترک ہوگا وہ قطعاً ہستی کا ارزل ترین اعتبار ہوگا۔ اب اس مجہولِ مطلق اور ارذلِ مطلق کو خود خالقِ کائنات قرار دینا ظلم و ناانصافی ہے' وہ ظاہر ہے۔ ادھر اللہ تعالےٰ کے متعلق اور اس کی صفات کے متعلق یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ (الف) اس کی ذات کے ساتھ صفات میں بھی کسی چیز کو کوئی شرکت نہیں (ب) وہ اپنی ذات کے ساتھ ہی اپنی صفات میں بھی ہر نقص و زوال سے کاملاً ورا الوریٰ ہے' منزہ اور پاک ہے۔ اس ایمانِ اوّل کو تسلیم کر لینے کے بعد کونسی گنجائش رہ جاتی ہے کہ اُسے سلسلۂ ہست و بود کا ایک جزوِ مشترک مانا جائے اور نعوذ باللہ ادنیٰ ترین جزوِ مشترک مانا جائے۔ یا پھر نقص و زوال کے لگاتار ریلے میں مسلسل بہنے والی کائنات اور اس کی اشیاء کو خدائے لاشریک و لازوال کا عین قرار دیا جائے'

چونکہ رومیؔ و اقبالؔ دونوں شاعر ہونے کے علاوہ فکری حیثیت سے وجودی ہیں اور پھر ان کی شاعری کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" اور "نیست پیغمبر و لے دارد کتاب" بتایا جاتا ہے۔ لہذا ان کی شاعری کے ساتھ اُن کی فکری وجودیت کا دینی وزن بھی عرض کر دیا گیا ہے ۔ دوسرا نقطۂ نگاہ آفاقی و مادی ہے مگر وہ وجودیت کے مقابل اپنی دہریت میں ایمان دار رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس نے کبھی مذہب کا لباس اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ اس کے اعتقاد و عمل کا یہ تضاد کسی صورت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ اعلان تو اس کا یہ ہے کہ یہ کائنات ہر قسم کی معقولیت و مقصدیت سے یکسر خالی اور محض بے شعور مادے کا ایک ہجومی قسم کا ظہور ہے لیکن عمل اس کا یہ ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے اور پیشاب پاخانے تک کے انفرادی اعمال سے لیکر پورے معاشرے تک کے اعمال کو معین مقصدیت اور معقول منصوبہ بندی کے سوائے ایک دن بھی چلانے کا روادار نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کائنات ہر قسم کی مقصدیت اور ہر قسم کی معقول پلیننگ کے سوائے بنی ہے اور اسی بے مقصدی اور اسی معقول پلیننگ سے خالی خولی چل رہی ہے تو پھر انسان جیسی ایک کمزور مخلوق کے لئے اس کی کیا اور کہاں گنجائش ہے کہ اپنے کل کی کل بے مقصدیت اور ہر قسم کے پلیننگ سے کلی خلا کے مقابل مقصد تراش پلین باز بنکر زندہ اور کامیاب رہے۔ ایک طوفانی سمندر کی سطح پر ایک مکڑی کے باقاعدہ جالا بننے کا تو شاید کوئی امکان ہو مگر بے مقصد کائنات اور بے پلیننگ کی کائنات میں انسان کی بامقصدیت اور معقول منصوبہ بندی کی تو اتنی بھی گنجائش نہیں۔ موجودہ دور کی متعصب دہریت و مادیت کے ایمان و عمل میں یہ اتنا بڑا تضاد ہے کہ اگر اُن کا تعصب کسی وقت ٹوٹا تو یہ کفر کا سارا اسراب چند دنوں میں چھٹ جائیگا۔ ایک جامع صفاتِ کمال خدا کی ایک با مقصد کائنات میں با مقصد منصوبہ بند اور امن و خیر کے متلاشی و طالب انسان کی تو گنجائش ہے۔ مگر بے مقصد و بے منصوبہ اور بے خدا کائنات میں امن، اتحاد، باقاعدگی کے متلاشی انسان کی کہاں گنجائش ہے؟ تیسرا نقطۂ نگاہ دینی و مذہبی نقطۂ نگاہ ہے، جسے تخلیقی نقطۂ نگاہ کہا جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ ایک "فعالٌ لِّمَا یَشَآءُ" خالق کا قائل ہے اور کائنات کو اس خالق کی مخلوق کہتا اور اُسی کی تدبیر خیر کے ماتحت اُسے ایک معین مقصد کے ماتحت چلتا دیکھتا ہے۔ حقیقت میں انسان کے کاروبار میں تدبیر منصوبہ بندی اور مقصدیت صرف اسی تصور کائنات کے ماتحت داخل ہوتی ہے۔ اُسے صرف اسی تصور کے ماتحت ساری کائنات کے حرکت و سکون میں اور اپنے حرکت و سکون میں اپنی بامقصدیت و تدبیر منصوبہ بندی میں اور کائنات کی بامقصدیت و تدبیر منصوبہ بندی میں ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے اور صرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی تصورِ کائنات میں انسان کے لئے امن و سکون و طمانیت و صلاح مقصور ہے ورنہ یہ ایک کھلا سفسطہ اور بیّن دجل و فریب ہے کہ انسان پوری کائنات کو تو ہر تدبیرِ خیر اور ہر امن و بامقصدیت سے یکسر خالی قرار دے اور اسی بے مقصد اور ہر تدبیرِ خیر سے خالی کائنات کے کسی کونہ میں اپنے لئے امن، بامقصدیت اور خیر و فلاح کی کسی دنیا کو تعمیر کرنے کے خواب دیکھے۔ ایسا سوچنے والے عقل، ایمان، دیانت سے یکسر خالی ہیں اور نوعِ انسانی کو فسادِ دائمی کا شکار کرتے ہوئے اُسے کالأنیست و نابود کرنے پر تُل گئے ہیں۔ اس گروہ کا نام دہریہ گروہ ہے۔ چونکہ مذہبی نقطۂ نگاہ صرف کائنات کی بامقصدیت اور تدبیرِ خیر کی پابندی ہی کا قائل نہیں بلکہ اُسے ایک ایسے خالق کی کائنات بھی مانتا ہے، جو لاتعداد صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ لہٰذا اس تصورِ خالق کے ساتھ ہی سیرتِ انسانی میں وہ نورانی عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے جسے اخلاقی ضمیر کہتے ہیں اور جو شر کے بجائے خیر، ظلم کے بجائے انصاف، خود غرضی کے بجائے ایثار، آلودگی کے بجائے عفت، جھوٹ کے بجائے سچ، جنگ کے بجائے صلح، نفرت کے بجائے محبّت، انتقام کے بجائے عفو، تکبر کے بجائے تواضع، جلد بازی کے بجائے صبر، تلون کے بجائے استقلال، غدر کے بجائے وفا، بے حیائی کے بجائے حیا اور یاس کے بجائے رجا سے سارے کاروبار کو چلانے کی مسلسل تلقین کرتا ہوا انسان کو اس کائنات کی اشرف ترین مخلوق بنا دیتا ہے۔ یہ ہے امن و فلاح و ترقی، انسان کی کائنات جسکی تعمیر اسوقت تک ایک امرِ محال ہے کہ جبتک اس کائنات کی بامقصدیت و تدبیرِ خیر کی پابندی کے اعتقاد کے ساتھ ہی فاطرِ کائنات اور اُس کی تمام صفاتِ کمال کے سامنے انسان رضاکارانہ طور پر سربسجود نہ ہو جائے۔ ٹھیک یہی وہ مقام ہے کہ جہاں ہر سعید الفطرت انسان "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ" کہہ اٹھتا ہے۔ اب اس حق کا اعلان کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ وہ شخص یا گروہ علی الاطلاق بطّال ہے، جو یہ اعتقاد رکھے کہ دو روٹیاں کھانے والے انسان سے چار روٹیاں کھانے والا انسان افضل ہے، پیادہ چلنے والے انسان سے سائیکل پر چلنے والا، سائیکل پر چلنے والے سے موٹر پر سوار ہونے والا، موٹر پر سوار ہونے والے سے ہوائی جہاز پر سوار ہونے والا انسان افضل ہے۔

ترقّیِ انسان کے یہ معنے بتانے والے سب بلا استثنا بطّال ہیں خود فریب ہیں، منافق ہیں۔ انسانی ترقی و فلاح و امن کا دار و مدار اصولاً انسان کی اخلاقی و روحانی تقدیر و تدبیر کے پورے یقین کے ساتھ ہمہ گیر ہونے پر ہے جس کے لئے دینی مذہبی نقطۂ نگاہ کو انتہائی درجے تک صاف کرنا اشد ضروری ہے۔ موجودہ وقت اور ماحول اس کا شدید تقاضا کر رہا ہے اور اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقاضے کو پورا کرنے پر آئندہ کی انسانی فلاح و بقا و امن کا دار و مدار ہے۔ اب اس مقام پر یہ اٹل حقیقت بھی بیان کر دی جائے کہ مادی مکتبِ فکر و دنیوی مکتبِ فکر دونوں کے دونوں شرافتِ انسانی کے پورے اخلاقی مقام سے ہمیشہ یکسر خالی رہے ہیں۔ فی الحقیقت دونوں مکتبِ دہریت کے مکتب ہیں۔ ایک تمام اوصاف سے معریٰ کسی ادنیٰ ترین اعتبار کائنات میں انسان کو گرانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا مادے کے نام کے کسی مجہولِ مطلق کی طرف نوعِ انسانی کو دھکیلتا ہے۔ دونوں میں اخلاقی استقلال کا نام و نشان تک ندارد ہے۔ رہا غایتِ بے یقینی، نہایتِ نفاق اور معاشرۂ انسانی کی مجبوریوں کے ماتحت اخلاقی قدروں کا کسی نہ کسی شکل میں قائل ہوتا اور کبھی کبھی اس کی نمائش کر دینا تو یہ بالکل دوسری بات ہے۔ یہ ان کی منطق کا تقاضا نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کے جبر کے سامنے آمنّا و صدّقنا کہنا ہے۔ چونکہ رومی و اقبال دونوں وجودی ہیں (اقبال نے اپنے لیکچرز میں اس کا اقرار کیا ہے اور رومی کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ وجودی تھے) لہٰذا ان دونوں مکاتیبِ فکر اور مذہبی نقطۂ نگاہ کا سرسری مگر اصولی موازنہ بھی ضرورۃً کر دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے بلکہ موجودہ عالمی فضا اس درجہ انسان کی اخلاقی و روحانی تقدیر و تدبیری نوعی کے مخالف کر دی گئی ہے کہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ تاویل و تدلیس کے سارے مغالطوں، مجازوں، تشبیہوں، استعاروں کے حقیقت سوز حجابات کو اکھاڑ پھینکتے ہوئے دین و مذہب کو ایک اور ایک دو اور دو اور دو چار کی طرح عالمِ انسانی کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی ہیرو پرستی کے ساتھ ہی موجودہ سب ہیرو زاد اور اُن کے خیالی متعلقات کو یکسر ایک طرف کرتے ہوئے، صریح محکماتِ قرآنی اور واضح اُسوۂ محمدیؐ کے علاوہ آج امتِ اسلامی میں باطنی اسرار و رموز کے نام سے یا سیاسی و معاشی نظریہ سازی کے عنوان سے جو شخص بھی گرد و غبار اُڑا رہا ہے وہ دانستہ یا نادانستہ دشمنیٔ دین و ملت کا کام کر رہا ہے۔ قرآنی عزیمتوں و محکمات اور اسوۂ محمد رسول اللہ کے علاوہ وہ دینی یقین کسی صورت پیدا نہ ہوگا، جو موجودہ عالم سوز دینی حرج و مرج میں امتِ اسلامی کو کوئی مقام دلا سکے۔ یا انسانیتِ عامہ کے لئے ایک حقیقی نشأۃِ ثانیہ کا سامان مہیا کر سکے۔ ہمیں دینِ واحد یا امتِ واحدہ کے دینی مقام سے انسانیتِ واحدہ کے دینی مقام کی طرف مارچ کرنا ہے اور اس کے لئے اشد ضروری ہے کہ دین کے نام سے نئی نئی پہیلیوں کا اضافہ و تجدید کرنے کے بجائے خود ماضی کے زمانہ لئے امن میں اسی نوعیت کا جو جو مغسطہ ہم نے تیار کیا ہے اس کا صاف صاف انکار کرتے ہوئے قرآنی ایمان و دین و محکمات اور اسوۂ محمدیؐ کو ایک مفصل پروگرام کی شکل میں سامنے لایا جائے۔ یہ کڑھا تجزیہ صرف اسی اساس پر کیا جا رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

 میں نے ایک معین مقصد کے پیشِ نظر رومی و "پولوس" کا موازنہ کیا تھا اور اُسی معین مقصد کے لئے اقبال و بدھ کا سرسری موازنہ بھی ضروری ہے۔ تاکہ دینِ انسانی کی بنیادی مسائل کے ساتھ ہی دینی طریقِ عمل بھی واضح ہو جائے۔ پُوری تاریخ کی روشنی میں واضح ہو جائے۔

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ بدھ روحِ انسانی کا قائل نہ تھا۔ یا اُس نے اُسے نظر انداز کیا جو یکسر بے بنیاد ہے حقیقت یہ ہے اور بُدھ کے دور کی پُوری تاریخ اس کی کامل تصدیق کرتی ہے کہ وجودیت کے طوفانِ بدتمیزی نے بُدھ کے زمانہ میں ماہیتِ روح اور ماہیتِ ذات وصفاتِ باری کے متعلق وہ اودھم مچا رکھا تھا جس نے پورے معاشرے میں ایک طرف کامل معاشرتی انارکی اور دوسری طرف لا اخلاقیت پیدا کر دی تھی۔ حالانکہ یہ ساری بحثیں صرف خیالی و وہمی اور سوفسطائیانہ ہوتی تھیں۔ اس صورتِ حال میں ایک مصلحِ اعظم کو اگر معاشرے کی عملی اصلاح کرنا ہو تو اُس کے لئے اشد ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس ساری زیاں کار بحث سے صَرفِ نظر کرتا ہوا معاشرے کو اس کے اخلاقی فرائض کی طرف متوجہ کرے۔ بُدھ نے ٹھیک یہی کام کیا۔ اُس نے اُن ساری معاشرہ کُش بحثوں کو کاملاً نظر انداز کیا اور معاشرے کو اس کے معین اخلاق و روحانی فرائض و واجبات پر لگانے کی مہم کا آغاز کیا۔ ورنہ جو شخص رُوحِ انسانی کا منکر ہو اس کے ہاں نجات، 'نروان'، موکش کے کیا معنے رہ جاتے ہیں۔ اگر روحِ انسانی کا کوئی وجود ہی نہیں تو پھر نروان کس کو دلایا جا رہا ہے۔ پھر حاضر کی تمام لذتوں کو نظر انداز کرنا اور زندگی کو سخت درجہ کے اخلاقی مجاہدات و ریاضتوں میں عمر بھر لگانے کے کیا معنے؟ لہذا اس کھلی اور میرے نزدیک بدیہی حقیقت کا انکار کرنا پڑتا ہے کہ بُدھ کے نزدیک روحِ انسانی وہ ذی شعور حقیقت ہے کہ جس کی تربیت و بقا اور آئندہ کی فوز و فلاح کا دارومدار انسان کے اخلاقی اعمال و اخلاقی محرکات کی قوت و ضعف و بے بسی و ہمہ گیری پر ہے۔ جس طرح جسدِ انسانی کی بقا و حفاظت کا مدار روٹی پانی اور صنفی تعلق پر ہے' بالکل انسان کی انسانی بقا و فلاح کا دارومدار چچے تُلے ان اخلاقی روحانی اعمال پر ہے کہ جو نہ صرف صورت میں اخلاقی و روحانی ہوں بلکہ اُن کے سارے داخلی محرکات بھی یکسر اخلاقی و روحانی ہوں۔ خواہشاتِ نفس کی نفی سے جو شخص انسانی ذات کی نفی کا نتیجہ نکالتا ہے وہ گدھے اور انسان میں بھی فرق کرنے سے معذور ہے۔ وہ ضرورت کے پورا کرنے کے اخلاقی فرض اور ہوا و ہوس کے ماتحت پاگل ہو کر چاروں طرف دوڑنے بھاگنے میں بھی فرق کرنے میں معذور ہو گا اور ایک سچا مومن اُسے اور اُس کے سارے اعتراضوں کو نظر انداز کرنے میں بھی معذور ہے۔ تمام ضروریاتِ حیاتِ جسدی کا پورا کرنا انسان کا ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاقی فرض ہی نہیں بلکہ روحانی فرض بھی ہے جنھیں پورا کرنے کے سوائے اخلاقاً بھی کوئی چارۂ کار نہیں لیکن ہوا و تمنا کی انگیخت پر چاروں طرف بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ شیطانی اغوا اور نفسِ حیوانی کی جبلّت (Instinct) کا کام ہے اور ان دونوں کا مرکز وہ ہے جسے مذہب کی زبان میں نفسِ امّارہ کہا گیا ہے۔ یہی اقبالؔ کی خودی ہے۔ اس کے مقابل وہ ملکوتی وارده یا نورانی عنصر کو جو نیک و بد کے اخلاقی احساس اور عذاب و ثواب کے روحانی احساس سے متصف ہے اور جس کی بقا و فلاح کا دارومدار ٹھوس ان اخلاقی و روحانی اعمال پر ہے کہ جو محرک بھی اخلاقی و روحانی رکھتے ہوں، بدھ کے ہاں انسانی انا کی حقیقت ہے۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ یہ ہے انسانی انا کی حقیقت کے بارے میں بدھ اور اقبالؔ کا فرق۔ بدھ کو اپنے جاوید نامے میں اقبالؔ نے خود بھی انبیاء کے دائرے میں دکھایا ہے۔ لہٰذا کسی اقبالؔ پرست کو اس پر اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

عمل کا موازنہ بدھ پورے پینتالیس برس وجودیت کی لا اخلاقیت کے مقابل اپنے اخلاقی (جو در حقیقت روحانی بھی تھا) پیغام کو پورے طول و عرضِ ہند میں گھوم گھوم کر پھیلاتا رہا۔ بلکہ تمام معلوم دنیا تک اپنی آواز پہونچاتا رہا۔ جہاں خود نہیں پہنچ سکتا تھا وہاں اپنے تیار کردہ مبلّغ بھیجتا رہا مگر جس طرح پولوس کے ساتھ روحی کو عمل کی سطح پر کوئی خاص مشابہت نہیں اقبالؔ کو بدھ سے اتنی بھی مناسبت نہیں۔ یہ ہے عمل کی سطح کے مذہبی آدمیوں اور محض شعر و فکر کی سطح کے خیالی لوگوں کا فرق۔ قابلِ اتباع صرف پہلے لوگ ہیں۔ دوسرے اگر کچھ ہیں تو بس اس قدر کہ کسی تلخی کے وقت ان سے لطفِ طبع حاصل کر لیا جائے۔ نہ یہ کہ انھیں ایمان و عمل کے شارح اور ہیرو قرار دیا جائے۔ ایسا کرنے سے ساری کائناتِ دین و اخلاق تہ و بالا ہو جاتی ہے۔

ایک مثال اب فرض کرو خدا نکردہ قرآن مجید اور اس کا شارحِ کامل اسوۂ محمدیؐ و اسوۂ معاشرۂ صحابہؓ کا سارا ریکارڈ دنیا سے یکسر منسوخ ہو جائے۔ لیکن تمام ملّت کے سیّد الشعرا حضرت حسّانؓ بن ثابت کے تمام اشعار کے ساتھ ہی ان کی تمام ایمانی دور کی عملی زندگی کا ایک ایک واقعہ محفوظ ہو اور نوعِ انسانی کے ساتھ ہی اُمّتِ اسلامیہ کو اصولِ دین اور اُن کا عملی اسوۂ حسنہ اسی حسّانی ریکارڈ سے ہی معیّن کرنا پڑے۔ تو بتائیے اس دین کے اصول کیا ہونگے اور اس کا مثالی نمونہ کیا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے اور کل حقیقت یہ ہے کہ ہر ہر گروہ نے اپنے اپنے دوائرِ ایمان و عمل کے لئے اسی قسم کے دوسرے اور تیسرے درجہ کے ہیروز آج معیّن کر لئے ہیں اور فطرتِ انسانی میں خدا پرستی کے لئے جو والہیت کا جذبہ ہے اُسے کمالِ اشتیاق سے انھیں ہیروز کی طرف منوجہ کر دیا گیا ہے اور جو کچھ حاسۂ اخلاقی موجود ہے وہ ایسے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیروز کی نقالی میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے اور ہیروز کے تراشنے اور پوجنے کے بیسیوں امکانات آئندہ کے لئے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس ساری سفسطہ سازی کو یکبارگی ایک طرف کرتے ہوئے بقولِ اقبالؒ

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

کی راہِ اتباعِ نبوی کی طرف پوری عزیمت سے پوری ملت کو آج رُخ کرنے کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے۔

بدھ اور حضرتِ مسیحؑ کے متعلق چند مفید باتیں

آج ایک طرف لادینیت کے علمبردار یہ کوشش کرتے ہیں کہ انسانی توجہ کو دینی واخلاقی فرائض و واجبات کی طرف سے ہٹا کر ثقافت و کلچر کے نام کے مشاغل کی طرف لگائیں اور دوسری طرف اسی ثقافت کو مختلف ممالک میں باہمی افہام و تفہیم، آمد و رفت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ خود لادینی نظریات و نظریئے بھی انٹرنیشنل تعلقات میں یکسانی پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ صرف لادینیت کو ہمہ گیر و عالمگیر کرنے کی تدبیریں ہیں۔ مگر مجھے ان شیطانی سطحوں پر وحدتِ انسانی کا خواب ہرگز ہرگز شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہ انسانی معاشرہ میں سے رہے سہے اخلاقی چونے سیمنٹ کو دور کرنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔ یہ مشاغل صنفی اباحت و اخلاقی انارکی کا موجب بن رہے ہیں۔ اس کے مقابل مجھے تمام مذاہب کے باہمی تقابل و توافق اور تمام تاریخِ مذہب کا تفصیلی مطالعہ وحدتِ انسانی کے خواب کی تعبیر کی واحد اور صحیح راہ محسوس ہوتی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر مذاہبِ عالم کا سرسری مطالعہ کیا ہے بلکہ انسانی بدوِ طفلی سے اس وقت تک کی تاریخِ مذہب کے جس جس باب کا پتہ چلا ہے اُسے اجمالاً دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی افادیتِ دینی کے پیشِ نظر بدھ ازم اور عیسائیت کے آغاز کے متعلق چند مفید باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس متقابل مذہبی مطالعہ کا ایک بنیادی فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے وحدتِ انسانی کے خواب کی تعبیر زیادہ آسان ہے بہ نسبت ثقافتی قربیوں کے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مذہب و تاریخِ انسانی کے نصب العینی ربط باہمی کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے اور مذہب و دین کی موجودہ یاس انگیز کس مپرسی کے باعث عالمگیر لا مذہبیت کے مقابل سماعت و اطاعت کی جو فضا مذہبی دنیا کے لئے بظاہر پیدا کر دی گئی ہے، وہ ایک شیطانی ہنگامہ و سراب محسوس ہونے لگتا ہے جس کی فطرتِ انسانی میں کوئی بھی بنیاد نہیں۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح ملّتِ اسلامیہ کو اپنے توحید و اخوت کے مشن کو عالمگیر کرنے کی راہوں کو سمجھنے میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ حیرت و افسوس کا آخری مقام یہ ہے کہ جو اُمت "نیابتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے باعث اس وقت تک تمام اقوامِ عالم کو "کلمۂ سواء" کا پیغام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتے رہنے پر مامور ہے، جب تک کوئی ملک و طبقہ بھی دینِ حق سے باہر ہے، وہ اُمّت خود اپنے اندر "دینِ سواء" کو رائج کرنے میں اس درجہ بے بسی محسوس کرتی ہے کہ اس کے سنجیدہ سے سنجیدہ مذہبی افراد و جماعتیں اُسے ایک ناممکن العمل کام سمجھتے بلکہ بتاتے ہیں اور اسی بہانے سے اپنے اپنے تن آسان حلقوں کے لئے کسی نہ کسی شخصیت یا شخصی نقطۂ نگاہ کا سہارا لیکر اپنی اپنی افادیت کو بحال کرنے یا بحال رکھنے کی فکر میں ہیں۔ حالانکہ ساری خوش فہمیوں اور حسن اعتقادوں کے باوجود یہ سب ساعی ملّت کو اپنی نصب العینی بقا اور نصب العینی یکساں قسم کے طریقِ عمل سے یوماً فیوماً بیگانہ کرتی جا رہی ہیں۔ اب اس حق کو چھپانا غایت درجہ کی منافقت ہے کہ اسلام اور اُمّتِ اسلامیہ میں حیاتِ انسانی کی کامل ترین مذہبی تعبیر و تشریح و تنظیم و تربیت کا کامل ترین سامان آج بھی موجود ہے اور عالمگیر طور پر موجود ہے۔ قرآن مجید و سیرت و اسوۂ محمدیؐ کی روشنی میں سارے عالم میں اُمّتِ اسلامیہ میں چند برسوں کے اندر ایک عالمگیر و فعّال وحدت بروئے کار لائی جا سکتی ہے اور انھیں چند برسوں کے اندر اندر اس کا رُخ سارے عالم میں "کلمۂ سواء" کی تبلیغ کی طرف کیا جا سکتا ہے اور ایک طرف اپنا اندرونی جذبۂ اصلاح اور دوسری طرف سارے عالم میں "کلمۂ سواء" کی تبلیغ تھوڑے عرصہ میں سارے اندرونی فقہی، کلامی، صوفیانہ اور سیاسی تضادوں اور اختلافوں کو ختم کرتا ہوا امت کو تاریخ کی فعال ترین اور اپنے تمام اعمال و افکار اور اپنے تمام ایمان و عمل اور جماعتی و انفرادی سیرت و کردار میں ہم آہنگ و یکساں ترین اُمّت بنا سکتا ہے۔ ہاں اس کے لئے تمام مذاہب اور پوری مذہبی تاریخ کا متقابل مطالعہ ایک بڑی مہمیز کا کام دے سکتا ہے۔

حضرت مسیحؑ اور مہاتما بدھ کو اُن کے اپنے اپنے مخصوص موقفِ تاریخ میں رکھ کر دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول اور ملّت کے دین کے شارح و مصلح تھے۔ حضرت مسیحؑ کی ملّت یعنی بنی اسرائیل میں تو تورات موجود تھی۔ یعنی مفصّل شریعت موجود تھی۔ نقص صرف یہ آگیا تھا کہ دین کے رسمی و شرعی پہلو کو نہایت تنگ نظر فقیہانہ انداز پر کل دین سمجھ لیا گیا تھا اور دین کی حقیقی بنیاد اور ناقابلِ بدل اساسی اجزا یعنی اخلاقی و روحانی اصولوں کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے انہیں بنیادی انسانی اصولوں اور قدروں کی اہمیت کو بحال کرنے کی کوشش شروع کی۔ حقیقی اخلاقی و روحانی اصولوں کی عدم موجودگی میں شریعت پرستی کو کھلا نفاق و ریا اور زر پرستی و سرمایہ داری قرار دیا۔ لیکن چونکہ یہودیوں نے اس اصلاح کو کالعدم کر دیا۔ لہٰذا حضرت مسیحؑ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس دنیا سے چلے جانے کے بعد جب ان کے متبعین نے گھر والوں سے مایوس ہوکر انسانیت عامہ کی طرف اپنی اصلاحی کوششوں کا رُخ کیا تو تھوڑے عرصہ بعد یہی خالص اندرونی قسم کی اصلاحی کوشش اپنی اصل سے علیحدہ ایک مستقل دین بن گیا۔ اگرچہ حضرت مسیح کی طرح بدھ کے زمانہ کے تاریخی ابواب موجود نہیں اور وہ ہندوستانی خرافات و افسانہ نویسی کی گہری دلدل میں گم ہیں پھر بھی بُدھ کے متعلق اُن کی تعلیم کے تمام یقینی طور پر معلوم اجزا " اس کا ایک عمدہ مجموعہ مہاتما بدھ کی صاف صاف تعلیم کا وہ حصّہ ہے جسے کچھ عرصہ سے مہاتما بدھی سوسائٹی " دھم پد " کے نام سے مسلسل شائع کر رہی ہے۔ اُسے بعض لوگ بُدھ ازم کی بائیبل کہتے ہیں " سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کے آریاؤں میں ایک مثیلِ مسیح مصلح تھے۔ ان دونوں میں ایسی تاریخی اور تعلیمی مشابہت ہے کہ بیسیوں مورخوں نے ایک کو " چونکہ بدھ حضرت مسیحؑ پر زمانی تقدم رکھتے ہیں لہذا انھیں کو " اصل اور دوسرے کو اُس کا خوشہ چین بتاتے ہیں، حالانکہ فطرتِ انسانی کے اخلاقی و روحانی تقاضاؤں اور ملتے جلتے ماحول میں اُن کے یکساں اظہار پر جن لوگوں کی نظر ہے، انھیں لامذہب مورخوں کے ان نتائج سے اتفاق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بدھ کے زمانہ اور ماحول کے متعلق یہ بات تو وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ایک طرف معاشرے میں ذات پات کا پورے زور سے رواج ہو چکا تھا اور شرافت انسانی کا معیار ایمان و عمل صالح کے بجائے نسل و خون کو قرار دیا جا چکا تھا۔ دوسری طرف کسی سوچے سمجھے ہوئے سیاسی منصوبے کے ماتحت یا محض بے فکرے پن اور بے عملی کے باعث ماہیتِ روح و ماہیتِ باری تعالیٰ کے متعلق ملک گیر بحثیں چل رہی تھیں۔ گو یا آریاؤں میں شمشیر و سنان کا دور گذر کر چنگ و رباب کے دور کا بھرپور آغاز ہو چکا تھا۔ اس مخصوص موقف تاریخ میں بدھ نے اپنی اصلاحی کوشش کو شروع کیا۔ بخلاف حضرت مسیحؑ بدھ کو اپنے ابتدائی مراحل میں کامیابی ہوئی اور صدی دو صدی تک یہاں بدھ ازم بظاہر حاوی ہو گیا مگر پھر برہمن سوسائٹی نے اُسے یہاں سے ختم کر دیا اور وہ اپنی اصل سے منقطع قسم کا ایک قنوطی انداز کا ایک عالمگیر نظامِ اخلاق بن کر رہ گیا۔ مگر اپنی اصل میں وہ ایک جاری مذہب کی حدود کے اندر ایک اخلاقی اصلاح کی حیثیت رکھتا تھا۔

رومی و اقبال کے سلسلے میں مسیح و بدھ کے ذکر کرنے کی غرض حقیقی مصلحینِ مذہب و ملتِ انسانی اور ہنگامی و عطائی انداز کے لوگوں کے تخیلات و طریقِ عمل کا واضح فرق بتانا مقصود ہے اس لئے کہ دوسرے قسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لوگوں کو ہیرو قرار دینے اور ان کے مشتبہ تخیلات کی چھان بین پر زور دینے کا نتیجہ دین و ملتِ انسانی کے اصل محکمات اور حقیقی اسوہائے حسنہ کو نصب العینی حالت سے مستور کر دیتا ہے جو نوعِ انسانی کی دینی عزیمتوں کو صراطِ مستقیم سے روک کر سُبُلِ متفرقہ پر ڈال دیتا ہے اور ضلالت و ہلاکت پر منتج ہوتا ہے۔ تمام سابقہ ملل کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور آج پوری ملتِ اسلامی کے ساتھ ہی سارے نوعِ انسان کے لئے یہی خطرناک فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ اِنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

عشق بحیثیت محرکِ عمل | ؎ شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما ؛ اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

رومی کے ہاں عشق تمام اعمال کا محرکِ کل ہے " اے طبیب جملہ علتہائے ما " پر غور کر لیا جائے۔ رہی یہ بات کہ خود عشق کیا ہے۔ یعنی "من حیث ہُوَ ہُوَ" اس کی کیا حد و فصل ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق محبت کی اس امتیاز سوز ڈگری کا نام ہے جو ایک تصورِ محبوب کے علاوہ باقی ہر امتیاز و تصور کو جلا کر خاکستر کر دے۔ اسے بھی خود رومی کی زبان سے سُن لیا جائے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

رہا پیرِ رومی کے مریدِ ہندی کا عشق تو اس کی حقیقت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی نفسِ امارہ کے لئے آرزو و تمنا کو مسلسل مہیا کرنے کا سول ایجنٹ (Sole Agent) خودیٔ انسانی۔ نفسِ امارہ کے استحکام میں مدد بہم پہونچانے والے عشق کی تو اقبال کے ہاں یہی حقیقت ہے۔ لیکن اس مخصوص ٹکنیکل معنے کے علاوہ بھی اقبال عشق کو ہر قسم کے محرک کے معنے میں استعمال کر جاتا ہے۔ مثلاً

بہ باغاں بادِ فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چوں پروین دہد عشق
شعاعِ مہر او قلزم شگاف است
بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

گویا ہر قسم کی حرکت پر اُبھارنے والا داعیہ عشق ہی ہے۔ یہ ہیں اقبال کے ہاں عشق کے خاص و عام معنے!۔

کتاب دین میں محرکاتِ عمل کیا ہیں | اب کتابِ دین میں محرکاتِ عمل کا استقصا کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) محبتِ الٰہی | انسان کے اعمال کا پہلا روحانی محرک محبتِ الٰہی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ محبت کو شعر و موسیقی اور بھگتی مارگ کے تمیز کش ایجنٹ یعنی عشق سے ہرگز ہرگز خلط ملط نہ کیا جائے۔ یہ لفظ یعنی عشق کا لفظ پوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب اللہ میں اور اس کے ساتھ ہی غالباً تمام صحیح دینی روایات میں ندارد ہے۔ بلا شک محبتِ الٰہی کا لفظ بلکہ محرکِ عمل قرآن مجید میں پوری قوت سے چند مقامات پر مذکور ہے۔ لیکن برخلاف عشق کے اس کے ڈانڈے سکر و مستی و امتیاز سوزی کے بجائے بالکل مفصل امتیازِ نیک و بد سے وابستہ ہیں۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ اللہ سے محبت اس کی ذات و صفات اور ذات و صفات میں شریک یا نہ ہونے پر مبنی ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ ابتدائی ایمانِ اجمالی موجود نہیں تو اس کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کم از کم ایمانِ اجمالی پہلے ہونا ضروری ہے۔ محبتِ الٰہی اسی کو مفصل و مکمل کرنے کا ایک عنصر ہے اور اس آیت میں محبتِ الٰہی کے حصول کو مرضیاتِ الٰہی کے اتباع پر منحصر بتایا گیا ہے اور مرضیاتِ الٰہی کا یہ اتباع اسوۂ نبویؐ کے اتباع میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ نبی کا ہر عمل اتباعِ ہوا و تمنا کے بجائے خالص اتباعِ رضائے الٰہی کا معیاری نمونہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے حصول سے محبتِ الٰہی کا حصول ایک قدرتی راستہ ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ یہ مقام بالکل امتیاز و شعور کی غایتِ بیداری کا مقام ہے، نہ کہ سکر و جذب و بے ہوشی و مستی و جنون کا مقام۔ ادھر حضرت عشق نام ہے محبت کے اس امتیاز سوز درجے کا جہاں "ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت" کا معاملہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سکر، مستی اور جنونِ عشق کے اصحابِ ثلاثہ ہیں اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان کی قیام گاہ کے لئے مسجد تو کسی صورت موزوں نہیں۔ بلکہ خانقاہ و مدرسہ بھی ان کی صحیح رہائش گاہ نہیں۔ ان کی قدرتی رہائش گاہ میخانہ اور چانڈو خانہ ہے اور بس۔ ادھر شعر بھی جب نصب العین حق کی غاشیہ برداری سے اور اس کا طفیلی ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور خود اپنے لئے مستقل مقام تعمیر کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے بھی عشق کا حلیف یا طفیلی بن کر میخانہ و چانڈو خانہ بلکہ بالفاظِ صحیح تکیے میں متمکن ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت میں عشق، مستی، جنون و جذب اور شعر و موسیقی بحیثیت دین کے بالکل اباحیتوں کا دین ہے۔ اس لئے کتابِ دین و اخلاق کے پورے لغت میں ان کا کوئی مذکور نہیں لیکن اصل محبت جو مرضیاتِ الٰہی کے مثبت اتباع کا محرکِ تام ہے وہ دینی و روحانی محرکات کا پہلا رکن ہے۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ"۔ خالص دینی محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور بڑی بھاری قوتِ امتیاز کو چاہتا ہے۔ خدا کی محبت، رسول کی محبت، دوست احباب فی اللہ کی محبت اور بالآخر زن و فرزند کی محبت اور بالآخر ان سب میں حفظِ مراتب کا پورا پورا خیال۔ یہ غایتِ امتیاز کا مقام ہے اور وہ جو "ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت" ہے، وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محبت کا وہ درجہ ہے جو محمود ہونے کے بجائے مکروہ و مردود ہے۔ ہاں وہ کبھی کبھی تکیے اور مے خانہ سے بھاگ کر خانقاہ میں آ جاتا ہے اور اپنے اعمال و افکار میں طہارت و عفت پیدا کر لیتا ہے تو بعض وقت بڑے بڑے معرکوں کو سر کرنے کے لئے اُبھار دینے کا کام کر جاتا ہے، یاس و بے بسی کی منجمد سطحوں کو ڈائنامیٹ کرتا ہوا ایک طوفان برپا کر جاتا ہے۔ ۵

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا   سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اقبال کے اس شعر نے کتنی دفعہ مجھے رلایا ہے اور گذشتہ چھبیس برس کی پوری بے سروسامانی سے رواں دواں زندگی میں تھک کر اور چور ہو کر گر جانے کے بعد کتنی دفعہ پھر کھڑا ہونے کے لئے مہمیز دی ہے۔ کسی تنہا کونے میں گرے ہوئے دو چار دفعہ اُسے میں نے گنگنایا اور نفس میں ایک گرمی محسوس ہوئی تو ضبط و تمکین لئے ہوئے چند گرم گرم آنسوؤں نے رخساروں سے ڈاڑھی کی راہ لی اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچھا شعر صرف یہ پیغام دے سکتا ہے اور بس۔ لیکن جب انھیں رجزوں کو تمام فکر کا نقطۂ ماسکہ بنا دیا جائے اور اُن کی دینی انداز کی تشریحات کے دفتر تیار ہونے لگیں تو پھر کتابِ دین کے ورق ورق کو منتشر کرتے ہوئے پوری پوری ملتوں کے لئے ہلاکت کا سامان بھی پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اَلشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ۔

بہرحال عشق کسی صورت اصل محرکاتِ دینی میں شامل نہیں۔ یہ اس لئے کہ دین ہر قدم پر غایتِ تمیز سے چلنا ہے اور عشق کا موسیقار سکر و مستی کے اپنے دو طبلچیوں کو لئے ہوئے کائناتِ تمیز کے خلاف کلی بغاوت کا سامان کر جاتا ہے۔ رہی محبتِ الٰہی تو وہ تمام مثبت اعمالِ صالحہ کا محرک کامل ہے۔ محبت کا داعیہ پھیلاؤ اور ہمہ گیری چاہتا ہے اور رجا من اللہ اس کی اصل ہے۔

(ب) خشیتِ الٰہی۔ | اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ“

ایمانی محرکات میں دوسرا درجہ خشیتِ الٰہی کا ہے۔ محبتِ الٰہی کا ذکر تو قرآن مجید میں دو ہی تین جگہ آتا ہے، مگر خشیت سے تو سب قرآن بھرا پڑا ہے۔ محبتِ الٰہی کا محرک و جذبہ بمنزلۂ غذا ہے یا تمام مثبت اعمال کرنے کے لئے بمنزلۂ اشتہا اور بھوک کے ہے اور اعمالِ صالحہ بمنزلۂ غذا ہیں۔ مگر خشیتِ الٰہی بمنزلۂ دوا ہے بلکہ بمنزلۂ ایک طبیب کے ہے جو تمام ناپسندیدہ اعمال و اخلاقِ سیئہ کے ارتکاب سے انسان کو روکتی ہے اور اُن کے ارتکاب کی صورت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا کفارہ وعلاج کرنے پر انسان کو مجبور کرتی ہے خشیت وتقویٰ کے الفاظ سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے یہی حالت سنت وروایاتِ نبوی کی ہے۔ جو خشیت وتقویٰ کا ذخیرہ ہیں۔

(ج) رضائے الٰہی۔ ایمانی محرکات کی فہرست میں تیسرا محرک رضائے الٰہی ہے۔ ایک مومن باللہ انسان ایک خاص وقت تک کبھی غایتِ محبتِ الٰہی کے باعث اور کبھی غایتِ خشیت کے سبب فرائض وواجباتِ حیات کو اثباتاً ونفیاً انجام دینے میں مصروف رہتا ہے لیکن جب اس کا پورا سکون وحرکت اور ساری ظاہری وباطنی زندگی صرف انھیں دو محرکوں کے ماتحت محدود ہو جاتی ہے تو پھر محبت وخشیت کے دو محرک اپنے جدا جدا امتیاز و تشخص کو کھو کر ایک ہی وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ظاہر وباطنِ انسانی تمام تضادوں اور دورنگیوں سے کاملاً پاک ہو کر بالکل یک رنگ اور فعال حالت اختیار کر لیتا ہے نفسِ انسانی تمام ہوا وتمنا سے کاملاً دستبردار ہو کر قلبِ سلیم اور روح کی کلی ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے۔ محبت وخشیت جب تک جدا جدا کام کرتے تھے تو ان کا مقام قلبِ سلیم تھا اور جب انھیں امتزاجِ تام پیدا ہو گیا اور رضائے الٰہی کا نزول شروع ہوا تو اس نورِ رضا کا مقام قلب کے بجائے نفسِ مزکی بن جاتا ہے۔ پہلی حالت میں اعمال کی حالت مجاہدے کی تھی۔ دوسری حالت میں اعمالِ صالحہ پر دوام اور ناپسندیدہ اعمال واخلاق سے اجتناب ایک فطری رجحان بن جاتا ہے اور سب فرائض وواجبات کے انجام دینے میں یسر وآسانی کی سب راہیں یکے بعد دیگرے کھل جاتی ہیں۔

"وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ"۔ رضائے الٰہی کا حصول فضلِ محض سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ عطائے رب ہے۔ مگر جو لوگ "اعمالِ صالحہ" تمام دوائرِ حیات کے "اعمالِ صالحہ" پر مواظبت اور سیئاتِ اعمال واخلاق سے اجتناب کے لئے کوشش "جو سرتاسر مجاہدہ ہے" کرتے ہیں ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ انھیں اپنے تمام اعمال میں نفس کی کل ہم آہنگی۔ "رضائے الٰہی" حاصل ہو جائے گی۔ تمام فرائض وواجباتِ انسانی پر عمل پیرا ہونا ان کے طبعی انداز کا یسر وآسانی بن جائیگا جس طرح حیوانات کے لئے مفید کی طرف کھچاؤ اور مضر سے بچاؤ ایک طبیعت بن جاتی ہے۔ اسی طرح مقامِ رضا میں نیکی کی طرف کھچاؤ اور بدی سے اجتناب طبعی ہو جاتا ہے۔

(د) اخلاص للہ۔ "وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ"۔ اخلاص للہ سارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روحانی محرکات کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کا آغاز تو محبّت کے محرک کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے مگر اس کی تکمیل محبّت و خشیت و رضا کے تینوں محرکات کی تکمیل پر ہوتی ہے، صرف محبّتِ الٰہی کے لئے، صرف خشیت کے لئے، صرف رضائے الٰہی کے لئے۔ یہ "صرف" محبّت کو، خشیت کو اور رضا کو اخلاص سے بدلتا جاتا ہے۔ یہ محرکات جب تک آمیزشِ غیر سے پاک نہیں ہوتے اُس وقت تک اخلاص کے اجزا نہیں کہلاتے، حالانکہ اُنھیں محبّت و خشیت و رضا کا نام دیا جا سکتا ہو لیکن جب آمیزشِ غیر سے پاک بھی کر دیئے گئے تو اجزائے اخلاص بن گئے۔ "اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ"

یہ ہیں اصولاً روحانی محرکاتِ عمل۔ مگر اس بیت المقدس یا بیت اللہ میں عشق کے مدہوش و مست رند کو آنے کی اجازت نہیں۔ نہ اس کا اس طرف گزر ہے۔ اُس کا اپنا جُدا دین و آئین ہے اور اپنے مسجد و منبر ہیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ روحانی محرکات اصولاً یہی چار ہیں یعنی محبّتِ الٰہی[1] (تمام مثبت اعمال کا محرک)۔ خشیتِ الٰہی[2]۔ (یعنی نامرضیاتِ الٰہی سے اجتناب کا محرک)۔ رضائے الٰہی[3]۔ (تمام ظاہری و باطنی فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کمالِ یکرنگی و یکسر کا محرک)، اخلاص[4]۔ (ان تمام محرکات کو شوائبِ غیر اللہ سے پاک کرنے کا محرک)

(۵) اخلاقی محرک۔ نصح۔ یا خیر اندیشیٔ غیر۔

"یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ" ۱۷/۸

"یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ فَکَیْفَ آسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ" ۱/۹

"وَلَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ۔ اِنْ کَانَ اللّٰہُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ" ۳/۱۲

"اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ" (الحدیث)

کتابِ دین کے روحانی محرکات کا اوپر سرسری مگر جامع تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اخلاقی محرک صرف وہ ہے جسے عام لفظوں میں خیر اندیشی کہتے ہیں یعنی انسان سے انسان کے، فرد سے معاشرے کے اور معاشرے کے فرد سے تعلقات کا محرکِ تام خیر اندیشی ہونا چاہیئے۔ خود غرضی، انتقام، جلبِ منفعت قسم کے محرکاتِ حیوانی جبلّت میں داخل ہیں انسان کی اخلاقی فطرت میں اُن کا کوئی مقام نہیں۔ خیر اندیشیٔ غیر کو قرآن مجید کی زبان میں "نُصح" کہا گیا ہے اور انسان کا تمام باہمی کاروبار اسی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ جس کی موجودگی میں فساد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُمّتِ اسلامیہ کے افراد و جماعتوں کے لئے باہمی تعلقات کو درست کرنے میں صرف خیر اندیشی کی پابندی کافی نہیں بلکہ اس خیر اندیشی کے لئے ایک اور شرط کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ شرط " رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ " ہے۔ ان کی خیر اندیشی باہمی رحمت کا لباس لئے ہوئے ہونی چاہیئے۔

یہ ہے کتابِ دین میں اختصار و جامعیت کے ساتھ دینی محرکات کی فہرست۔ محبت ان محرکات کا آغاز ہے۔ مگر وہ اندھی محبت نہیں کہ جو تمام امتیازوں کو جلا کر رکھ دے۔ وہ تو چانڈو خانوں اور تکیوں کی بے تمیز ترنگ ہے اور اُسے اصطلاحِ عام میں عشق کہتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ تطہیر و عفت و تزکیہ کے بعد بھی بڑے سے بڑا جو کام کر سکتی ہے وہ بھگتی مارگ کا قائم کرنا ہوتا ہے، جن کا کام رقص و سرود کی محفل قائم کر دینا ہوتا ہے۔ ؎

یکدست جامِ بادہ و یکدست زلفِ یار
رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست
(رومی)

اور یہ ہے انسانی جامع اور خداداد بے شمار اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو کمالِ بیدردی سے قتل کر دینا۔ (انسانی جامع صلاحیتوں میں سے بعض کی تربیت و تکمیل محبّتِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ بعض کی خشیتِ الٰہی سے ہوتی ہے بعض کی رضائے الٰہی سے ہوتی ہے اور کل روحانی شخصیت کی اخلاص سے ہوتی ہے اور معاشرے کے جماعتی تعلقات کی تربیت و تکمیل نُصح و خیر اندیشی اور بالآخر " رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ " سے ہوتی ہے۔ یہ محرکات ہماری اخلاقی و روحانی حیات کے وٹامن۔ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی وغیرہ ہیں جن کی مہیائی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔) ایسے بے شمار فرقے روحانیت و تزکیہ اور سلوک و تصوّف کے نام سے قائم ہیں اور مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ فرائض و واجباتِ اُمّت کے کسی واضح تصوّر کے ماتحت ماضی کی اس ابتری کو ختم کرنے کے بجائے کیا یہ جا رہا ہے کہ خالص سیاسی نوعیّت کے اور خالص اقتصادی نوعیت کے نئے سے نئے اور فرقے دین و مذہب کے نام سے قائم کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہے بربادیٔ انسان کا سامان۔

عمرانِ انسانی کا سامان۔ تجدیدِ دین واتنے وحدتِ انسانی کی طرف	؎ کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا (اقبال)

؎ شعر میں تھوڑا تصرف کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojarajd.com

قرآن مجید و اسوۂ محمدیؐ کی عالمگیر تعلیم المسلمین اس تجدید کا نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے۔ قرآن دینِ انسانی کا اصولی بیان ہے اور اسوۂ محمدیؐ اس کی عملی تعبیر کا معیاری نمونہ۔ ان دونوں کو سو فیصدی اپنانے کی راہ میں جو جو تفرقے حائل ہیں (اور وہ اصولاً یا شخصی نقطۂ ہائے نگاہ کا ہیرو پرستانہ تتبع ہے اور یا فلسفیانہ اور متکلمانہ اسرار جوئیاں ہیں) ان سب کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ میرا یقین ہے کہ اگر اقبالی شعور و تخیل کے پیدا کردہ پاکستان نے اپنے عالمِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی کھلے کھلے محرماتِ دینی" ۔ مثلاً زنا، شراب، جوا، سود اور ان کے تمام ملحقات" ۔ کو ختم کر دیا ہوتا اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کے کھلے کھلے فرائض و واجبات ۔ "نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ" ۔ کو بلا تاویل اپنے ہاں لاگو کر دیا ہوتا اور ساتھ ہی قرآن مجید و اسوۂ نبوی کی عالمگیر تعلیم و تبلیغ کو کسی معین نظام کے ماتحت چلانے کی کوشش کا آغاز کر دیا ہوتا تو بظنِ غالب اس وقت تک انڈونیشیا سے مراکش و ترکی تک انسانی حقیقی نشاۃِ ثانیہ کی ایک لہر پیدا ہو چکی ہوتی۔ یہ ہوتا مشرق کی طرف سے مغرب کی لادینیت کا جواب۔

آج اندرونی طور پر ہزار در ہزار نئے اسباب تفرقہ کے پیدا ہو جانے کے باوجود خالص مادی اسباب کے ماتحت انسانیت ایک دائرے کی طرف سمٹ رہی ہے۔ مگر یہ محض مادی اسباب کا جبر ہے جو بالآخر عمرانِ انسانی کے بجائے ہلاکتِ انسانی کے سارے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیا یہ وقت نہیں کہ جب سارے حساس دینی افراد و جماعتوں کے ساتھ ہی اقبالی گروہ بھی اس طرف متوجہ ہو؟ "اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ" ؟ دیکھیں اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ والسلام۔

ماہنامہ بُرہان دہلی

مالک ۔ ——— ندوۃ المصنفین ۔ دہلی
مدیر ۔ ——— مولانا سعید احمد ایم ۔ اے ۔ اکبر آبادی
مقامِ اشاعت ۔ ——— اردو بازار جامع مسجد دہلی
سالانہ چندہ ——— مبلغ چھ روپے
فی پرچہ ——— باسٹھ نئے پیسے
مولوی حکیم ظفر احمد خاں پرنٹر و پبلیشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی علا سے شائع کیا

© rasailojarajd.com

© rasailojaraid.com

مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط

جناب خلیق انجم صاحب اُستاد شعبۂ اُردو۔ کروڑی مل کالج دہلی

(۳)

مکتوب شصت و ششم

فقیر نواب یعنی عماد[۵۱] الملک کی آرزو سے بہت شرمندہ ہو۔ ارادہ ہو کہ گھر واپس جاتے ہوئے متھرا سے گذروں اور متھرا میں ٹھہر کر اپنے پہنچنے کی خبر پہنچاؤں۔ اور وہ (عماد الملک) متھرا میں آئیں۔ ایک دو روز

---

[۵۱] عماد الملک کا پورا نام میر شہاب الدین تھا۔ یہ فیروز جنگ غازی الدین کا لڑکا تھا۔ جب فیروز جنگ کو احمد شاہ بادشاہ نے دکن کے انتظامات پر مقرر کیا تو دکن جانے سے پہلے فیروز جنگ نے اپنے لڑکے شہاب الدین کو نیابت میر بخشی گری پر مقرر کرا دیا۔ تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال کے لئے اُسے صفدر جنگ وزیر کے سپرد کر گیا۔ جب فیروز جنگ کا دکن میں انتقال ہو گیا تو صفدر جنگ نے لحاظ اور مروّت میں اسے میر بخشی کا عہدہ اور عماد الملک کا خطاب دلوا دیا۔ عماد لڑکپن ہی سے ہوشیار، ذہین اور بہادر تھا۔ اپنے جوڑ توڑ اور صفدر جنگ کی کچھ غلطیوں سے فائدہ اٹھا کر احمد شاہ کو صفدر جنگ کا اتنا مخالف کر دیا کہ وزیر کو بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنی پڑی۔ صفدر جنگ نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ کر دیا۔ چھ ماہ تک مسلسل لڑائی رہی۔ عماد کی بہادری اور ہوشیاری سے صفدر جنگ کو شکست ہوئی۔ صفدر جنگ کے بعد وزارت کے عہدے پر قمر الدین وزیر کا لڑکا انتظام الدولہ فائز تھا۔ اس کی وزارت کا زمانہ مارچ ۱۷۵۳ء سے مئی ۱۷۵۵ء تک ہے۔ انتظام الدولہ کے نام بھی مرزا صاحب کے دو خطوط ہیں جن کا ترجمہ گذشتہ قسط" برہان نومبر ۱۹۶۳ء ص/ ۳۰۷ - ۳۰۹" میں کیا جا چکا ہے) دربار میں انتظام الدولہ کے خلاف بغاوت ہو رہی تھی عماد الملک نے مرہٹہ سردار ہولکر اور خاص طور پر صمصام الدولہ میر آتش کی مدد سے انتظام الدولہ سے وزارت چھین لی اور خود اس عہدے پر فائز ہو گیا۔ اسے احساس تھا کہ مغل بادشاہ احمد شاہ اس کا سخت مخالف ہے اس لئے عماد نے احمد شاہ اور اس کی ماں کو گرفتار کر لیا اور ایک ہفتہ بعد دونوں کو اندھا کر دیا۔ ۱۱۶۷ھ میں جہاندار شاہ کے پوتے عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا اور پھر پنجاب کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ لاہور احمد شاہ دُرّانی کے قبضہ میں تھا وہ معین الملک کو گورنر بنا گیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی مغلانی بیگم یہاں کی گورنر تھی۔ احمد شاہ ابدالی اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا اور اُسے بہن کہتا تھا۔ عماد نے مغلانی بیگم کو گرفتار کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اور تین لاکھ روپے کی پیشکش کے بدلے آدینہ بیگ کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ جب دُرّانی نے یہ خبر سُنی تو فوراً ہندوستان پہونچا۔ آدینہ بیگ فرار ہو گیا۔ عماد کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس کے معافی مانگنے اور خود مغلانی بیگم کی سفارش پر اُسے رہا کر دیا گیا۔ یہ ۱۱۷۰ھ کا واقعہ ہے۔ درانی دو مغل شہزادوں کے ساتھ (باقی آئندہ صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملاقات کر کے فقیر کو رخصت کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فقیر جاٹ کے قلعوں (سورج مل جاٹ) میں ہرگز داخل نہیں ہوگا اور دوسری شرط یہ ہو کہ فقیر پانی کے کنارے تک (جمنا کے کنارے تک) نواب کی کوئی خاطر مدارات قبول نہیں کرے گا خواہ وہ راضی ہوں یا نہیں۔ اگر تم سے ہو سکے تو نواب کو ان شرائط پر راضی کر کے اطلاع دو تا کہ ہمارا وہاں جانا بیکار نہ ہو۔ بعض آثار سے ملاقات کی توقع بہت کم ہے۔ خدا تم کو بزرگوں کے طریقے پر ثابت قدم رکھے۔ کیونکہ دنیا داری کے مشاغل اور "بیگانگانِ طریقہ" کی صحبت بہت بڑی مصیبت ہے۔ افسوس ہے کہ تم نے دنیا کے لئے آخرت کو چھوڑ دیا ہے اور (دنیا) ہاتھ نہیں آتی۔ اگرچہ دنیا اگر میسّر ہو جائے تو آخرت کی بنیاد ہے۔ سنا ہے کہ نواب نے اپنے رفیقوں کا غیر حاضری کی وجہ سے قلیل سا وظیفہ (مالی مدد) بند کر دیا ہے (حالانکہ ان رفیقوں میں ہر ایک کا وجود ایک الگ فائدہ رکھتا ہے۔ شاہ محمد جو یارانِ طریقہ میں سے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں میں آگئے اگر ہو سکے تو کہنا کہ اُن کا (نواب کا) بھلا اسی میں ہے کہ یہ طریقہ چھوڑ دیں۔ اس سے نقصان ہوتا ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ محمد احسان احمدی کا وظیفہ بھی بند ہو جائے گا۔ قِس علیٰ ہذا۔ والسّلام۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) عماد کو اودھ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں سے دولت حاصل کی جا سکے۔ اس دوران میں عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ کی درّانی سے ملاقات ہوئی۔ بادشاہ کی شکایات پر عماد کو برطرف کر دیا گیا اور نجیب الدولہ کو امیر الامراء کا عہدہ دیدیا گیا۔ عماد نے یہ خبر سُنی تو ہالکر اور رگھنا تھ راؤ کو دکن سے بلا کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ پینتالیس دن تک جنگ رہی۔ آخر نجیب الدولہ نے ہالکر کو رشوت دیکر اپنی طرف ملا لیا۔ عماد کو مجبوراً صلح کرنا پڑی۔ نجیب الدولہ اپنے علاقہ کی طرف چلا گیا۔ اب عماد ایک بار پھر دہلی میں ڈکٹیٹر تھا۔ اُس نے ۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء کو عالمگیر ثانی کو اور ۳۰ر نومبر کو انتظام الدولہ کو قتل کر دیا (مغل حکومت کا زوال ص/ ۲۱۴ - ۲۱۵ - جلد دوم) درانی نے جب یہ خبر سنی تو پھر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ عماد دہلی سے فرار ہو کر سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پناہ گزین ہو گیا۔ اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اسی زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ عالمگیر ثانی کا قتل خود عماد الملک کی موت تھی۔ اگرچہ وہ کچھ سال اور زندہ رہا۔ مگر بے عزتی اور گمنامی کی زندگی گذارتا رہا۔ عماد صرف سیاست داں ہی نہیں تھا بلکہ شاعر اور علم دوست بھی تھا۔ جیراتی لال بے جگر نے اس کے تفصیلی حالات کے بعد لکھا ہے کہ عماد عربی، ترکی، کشمیری، افغانی، مرہٹی اور دیگر زبانہائے ہندی خوب جانتا تھا۔ فارسی میں صاحبِ دیوان تھا۔ (تذکرہ بے جگر ورق ۱۹۶ - مملوکہ مالک رام صاحب) مصحفی کا بیان ہے کہ عماد الملک پہلے آصف اور بعد میں نظام تخلص کرتا تھا اور ابتدائے عمر سے شاعر پرستی اور موزونیٔ طبع میں مشہور ہے۔ مصحفی نے عماد کے پانچ اشعار بھی دیئے ہیں (تذکرہ ہندی ص ۲۵۸ - ۲۵۹) عماد الملک کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہوں: مغل حکومت کا زوال جلد اوّل ص/ ۵۴۴ - ۶۴۴ - جلد دوم ص/ ۱ - ۵ اور ۵۲۶ - ۵۲۸، ماثر الامراء جلد دوم ص/ ۸۴۷ - ۸۵۶، سیر المتاخرین جلد سوم ص/ ۸۹۳ - ۹۰۸ -

© rasailojaraid.com